تصوف

اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں

جناب سید عبدالباری

ہندوستان میں تصوف کا ابتدائی دور نہایت تابناک ہے ہمارے وطن میں اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اس کی بنیادوں کو مستحکم بنانے کا فخر انھیں بزرگوں کو حاصل ہے جو مختلف صوفیانہ سلسلوں سے وابستہ رہے ہیں۔ اور جنھوں نے اقتدار کے سرچشموں سے الگ اور اپنی گلیم فقر پر قانع رہ کر لوگوں کے دلوں کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ہندوستان میں تصوف کا یہ رنگ کسی نہ کسی حد تک ہماری موجودہ صدی تک تسلسل کے ساتھ برقرار رہا لیکن مختلف ادوار میں انقلاب وحوادث کی لہروں کے ساتھ اس کے رنگ وروغن اور تاثیر وتاثر میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے ادبار وزوال کے ساتھ ہی ساتھ بدقسمتی سے تصوف کی بھی صورت کافی مسخ ہوگئی، اور وہ زوال پذیر معاشرہ کو سنبھالنے کے بجائے اس کی ازخود رفتگی میں اضافہ کا ایک وسیلہ بن گیا۔ صرف چند ایک خانوادوں کو چھوڑ کر باقی اس عہد کے تصوف وروحانیت کے دعوے داروں کی اکثریت ریاکاری بوالعجبی سطحیت اور نمود ونمائش کے انھیں امراض میں مبتلا ہوگئی جس میں اس عہد کے امراء واکابر مبتلا تھے یہ عوام کی رہنمائی کے بجائے خود عوام کے جذبات کے تابع ہوگئے۔ حالانکہ اس عہد میں تصوف کا غلغلہ کم نہ ہوا حتیٰ کہ کسی نہ کسی صوفیانہ سلسلہ سے وابستگی کے بغیر اس عہد کا مذہبی طبقہ نجات کا تصور نہیں کر سکتا تھا جیسا کہ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں شروع ہی سے اسلام پر تصوف کا رنگ اس قدر

چڑھا ہوا ہے کہ بیسویں صدی کے شروع تک کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوتا تھا
کہ کسی سلسلہ میں داخل ہوئے بغیر انسان اسلام کی برکات سے مستفید بھی
ہو سکتا ہے[1]"

لیکن اٹھارویں صدی میں وہ تصوف جس نے ماضی میں ہندوستانی معاشرہ کی تشکیل نو میں انقلاب آفریں رول ادا کیا تھا، فقط چلّہ کشی، ذکر بالجہر، سماع بالمزامیر، قبور پر روشنی، غلاف اور چادر چڑھانے، عورتوں کے ہجوم، سجدۂ تعظیمی، پیروں کی قدم بوسی اور ان کی جبہ سائی، توحید وجودی، دعویٰ اناالحق، وغیرہ کے قصّوں میں الجھ کر رہ گیا۔ انسانی کردار میں فعّالیت اور حرکت پیدا کرنے کی اس میں صلاحیت باقی نہ رہی یہ سماج کی دیگر رسوم کی طرح ایک رواجی مشغلہ بن کر رہ گیا۔ لوگوں نے تصوف کی بنیادی تعلیمات کو بالائے طاق رکھدیا۔ اب مذہبی طبقات میں بھی احساسِ مساوات کے بجائے اونچ نیچ کے احساس نے گھر کرلیا۔ حسب ونسب اور رنگ ونسل کے مجد وشرف کے نعرے بلند ہونے لگے۔ خدمت خلق کی جگہ مذہبی طبقات نے خود اپنی خدمات پر لوگوں کو مائل کرنے کے لیے شعبدوں کا سہارا لیا۔ سادگی وفقر کی بساط پلٹ کر مذہبی خانوادوں نے بھی شاہانہ شان وشوکت اور کر وفر کو مطمح نظر بنالیا روح کو تقویت پہنچانے والے اسباب سے زیادہ جسم کو فربہ بنانے والے طریقے عزیز ہو گئے، عشق کے سوز وگداز اور عبادت کے کیف وسرور کے بجائے لذتِ کام ودہن میں لوگوں کے لیے زیادہ کشش پیدا ہو گئی ادھر صوفیا، کے ایک طبقہ میں بقول ضیاء احمد بدایونی[2] عالم کو بے حقیقت سمجھنے اور دنیا سے بے رغبتی کے رجحان نے بے عملی، بے کاری، سستی وانفعالیت کا روگ پیدا کردیا۔ غلو فی الدین کے نتیجہ میں عبادت کے نئے نئے طریقے مجاہدہ کی نئی نئی صورتیں اور قبور ومزارات پر طرح طرح کی بے اعتدالیاں ظاہر ہونے لگیں۔

---

[1] رودکوثر۔ شیخ محمد اکرام۔ تاج آفس بندر روڈ کراچی ص ۱۷۸

[2] مباحث ومسائل۔ ضیاء احمد بدایونی ص ۳۳

اس موقع پر ہندوستان میں تصوف کے زوال اور اس کے احیاء کی کوششوں کا بھی مختصراً جائزہ لینا مناسب ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اٹھارویں صدی میں ایک طرف تو اودھ کی مختلف خانقاہوں تکیوں اور درگاہوں میں تصوف مریضِ نیم جاں کی طرح دم توڑ رہا تھا تو دوسری طرف شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کے لوگ اسے ایک زندہ و فعّال تحریک اور اصلاحی قوت بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی جدّوجہد کے اثرات، اودھ پر بھی پڑ رہے تھے۔ ان کی اس جدوجہد کا پس منظر سمجھنے کے لیے ماضی کی طرف پلٹنا ہوگا۔

ہندوستان میں جو صوفیانہ سلسلے مسلمانوں کی سلطنت کے ابتدائی عہد میں رائج تھے وہ قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ تھے ان تینوں سلسلوں میں بقول شیخ محمد اکرام[۱] "جزوی اور فروعی اختلافات تھے۔ لیکن ان کا روحانی پس منظر ایک تھا۔ اور ان سب میں وہ عجمیت جو دورِ عباسیہ کو دورِ اموی سے اور بغداد کے متکلمین اور فلسفیوں کو مدینہ منورہ کے محدثین و فقہاء سے الگ کرتی ہے موجود تھی۔ تینوں میں وہ صلح کل کا طریقہ مقبول تھا جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے اخذ فیض کرنے سے اجتناب کیا جاتا تھا۔ تینوں میں شرع کے معاملے میں تھوڑی بہت آزادی تھی اور تینوں میں وحدت الوجود کا طریقہ رائج تھا۔"

اکبر کے عہد میں خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان میں ایک نئے سلسلہ (نقشبندیہ) کی بنیاد ڈالی وہ اس سلسلہ کو ایران سے نہیں بلکہ توران سے لے کر آئے تھے جس میں شرع پر بہت زور تھا۔ اس سلسلہ میں جہانگیر کے عہد میں ایک انقلاب آفریں شخصیت حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی کی عالمِ ظہور میں آئی جس نے اپنے زمانہ کے گمراہ کن نظریات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا انھوں نے وحدت الوجود کی جگہ وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا جس کے تحت ہمہ اوست کے بجائے ہمہ از اوست کا پیغام دیا اور انا الحق کے بجائے انا عبدہٗ کی صدا بلند کی نیز وصل کے بجائے عشق پر زور دیا۔

شیخ احمد سرہندی کے عہد میں وجودی تصوف کے علمبرداروں نے اسلام کی عملی

---

[۱] رود کوثر۔ شیخ محمد اکرام ص۱۹۲

تعلیمات کو بالائے طاق رکھ کر رہبانیت اور ترک دنیا کا میلان پیدا کر دیا تھا۔ شاہجہاں کے عہد میں میاں میر لاہوری نام کے ایک بزرگ تھے جو قادریہ سلسلہ کے تھے اور وحدت الوجود میں یقین رکھتے تھے۔ داراشکوہ ان کا بے حد معتقد تھا۔ اس نے میاں میر کا یہ ارشاد نقل کیا ہے "جب سالک پر عالم ملکوت کشف ہو جاتا ہے تو ہم اسے جنگلوں میں بھیج دیتے ہیں تاکہ تنہائی میں یاد خدا کرے۔" اس وقت بقول شیخ محمد اکرام نہ صرف مشائخ کے حلقے بلکہ اہلِ علم کی مجلسیں اور شاہزادوں کے دربار وحدت الوجود سے گونج رہے تھے ان حالات میں مجدد الف ثانی نے حال کو تابع شریعت کرنے اور شریعت و طریقت کے جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے فرمایا کہ مقام وحدت الوجود سالک کو ابتدائے سلوک میں پیش آتا ہے جس سے اس کو گزر جانا چاہیے اور جو شخص اس سے بالاتر مقام پر عروج کرتا ہے، اس پر مقام وحدت الشہود منکشف ہوتا ہے جو شرع کے عین موافق ہے۔ آپ نے صوفیا، کے احوال و مقام کے اشتہار اور اس کے تذکرہ اور ان پر یقین و اعتماد سے باز رہنے کی تلقین کی اور ان کے کشف و احوال کو شریعت کی کسوٹی پر کسنے کی ہدایت کی خوابوں پر اعتبار کرنے سے منع فرمایا۔ حضرت مجدد کے مکتوبات کو جو اصلاح و تربیت اور تبلیغ و تلقین کے مقاصد سے لکھے گئے۔ اس عہد میں اور بعد کے ادوار میں بے حد مقبولیت حاصل رہی اور بقول عبدالماجد دریابادی تصوفِ اسلام پر اس سے جامع کتاب مشکل سے ہی ملے گی اس مجموعہ کے ایک خط میں جو ایک صالحہ عورت کے نام ہے، ان تمام بدعتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن میں اس وقت کی ہندوستانی عورتیں مبتلا تھیں مثلاً سیتلا اور چیچک کے موقع پر دیوی کی منت ماننا، مشائخ کی قبروں پر منت کے جانور ذبح کرنا، پیروں کے روزے رکھنا، شگون کا اعتبار کرنا، جادو کا قائل ہونا، وغیرہ۔ ان ہی مسائل سے آگے چل کر اودھ کے علاقوں میں سید احمد اور شاہ اسماعیل شہید کو دوچار ہونا پڑا۔

تصوف کو جادۂ اعتدال پر قائم کرنے کی شاہ عبدالحق دہلوی نے بھی کوشش کی جو اکبر کے عہد میں پیدا ہوئے ان کا خیال تھا کہ توحید وجودی کا وہ طومار جو صوفیا

کے یہاں ملتا ہے سلوک اور باطنی تعلیم کے لیے ضروری نہیں بلکہ اصل ضرورت ریاضت کی ہے جو اہل سنت وجماعت کے اعتقاد کے مطابق ہو۔ شیخ عبدالحق کے فیض سے ہندوستان میں علم حدیث کو فروغ ہوا اور شریعت کی حدود کا لحاظ بڑھا اور باطنیت کی بوالعجبیاں کم ہوئیں۔

لیکن ان اصلاحی کوششوں کے باوجود تصوف کے وجودی حلقہ میں انتہا پرستی برقرار رہی۔ اور اس کا نتیجہ اورنگ زیب عالمگیر اور داراشکوہ کے اختلافات کی شکل میں رونما ہوا اس زمانہ میں اکثر سربرآوردہ مسلمانوں میں یہ رجحان تھا کہ ہندو جوگیوں اور راہبوں کی طرح جو صوفی اپنے نفس پر جبر کرنے اور محیّر العقول کرشمے انجام دینے میں پیش پیش ہوتا وہ ان کے نزدیک زیادہ صاحب روحانیت اور بزرگ و برتر سمجھے جانے کا مستحق تھا چنانچہ میاں میر کے مرید شاہ بدخشی کے بارے میں داراشکوہ لکھتا ہے۔ "شروع میں آپ نے ۷ سال تک عشاء کی نماز کے بعد سے صبح تک حبس نفس سے ذکر خفی کیا اور آپ کی ریاضتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اب تک ۱۰۵۲ھ پورے ۳۰ سال سے کچھ اوپر آپ نے ایک لحظہ اور ایک پل بھی نیند کا لطف نہیں اٹھایا۔ انھیں ملّاشاہ بدخشی کے یہ اشعار دارا نے نقل کیے ہیں ؎

پنجہ در پنجہ خدا دارم　　　من چہ پروائے مصطفیٰ دارم
مومن نہ شود تاکہ برابر نشود　　　بابانگ نماز بانگ ناقوس فرنگ

داراشکوہ نے اسلامی تصوف اور ہندی ویدانت میں زبردست ہم آہنگی دکھلائی اور "مجمع البحرین" نام کی کتاب لکھی جو مسلمان صوفیوں اور ہندو یوگیوں کے عقائد کا مجموعہ ہے دارا کے ہی ایک نیاز مند بھویت رائے بیغم نے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی اور تصوف اور ویدانت کو ایک جگہ جمع کیا۔ اس مثنوی میں اس عہد کے صوفیاء کے عام خیال کے مطابق ترک دنیا کو احساس وجود اور علّت زندگی ختم کرنے کا واحد علاج قرار دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں پورے تصوف کا یہی نچوڑ تھا۔ کہ دنیا کو ایک اہم اور بے حقیقت شئے قرار دیا جائے۔ اس

کی بے ثباتی کا شدید احساس بیدار کیا جائے اور ترک دنیا پر لوگوں کو مائل کیا جائے اس عہد کے صوفیار کی کوششوں سے ہندو مذہب اور اسلام کے درمیان بُعد ختم ہوا اور اسلام سے ہندوؤں کے تنفر و بیگانگی میں کمی آئی۔ نظریاتی اعتبار سے تسبیح و زنّار میں جو قدر مشترک تلاش کر لی گئی تھی اس کی وجہ سے شیخ و برہمن دونوں کی زبان پر یہ نغمہ تھا ؎

ہر خم و پیچ کہ شد از تاب زلف یار شد
دام شد تسبیح شد زنجیر شد زنّار شد

صوفیاء کی اس آزاد روی اور شریعت اور معاشرہ کے اخلاقی ضابطوں کے استخفاف کی وجہ سے اس عہد کی عام اخلاقی حالت سدھرنے کے بجائے اور بگڑ گئی جادوگروں، رمّالوں اور کرامت کے دعویداروں سے بقول شیخ محمد اکرام[۱] دارالخلافہ بھرا پڑا تھا۔ اور بدعلمی و توہم پرستی عام تھی۔ اورنگ زیبؒ نے اس صورت حال کی اصلاح کی اپنے طریقوں سے کوشش کی۔ معاشرہ میں قانون کے زور سے کچھ عرصہ کے لیے شراب نوشی، بازاری عورتوں کا کاروبار، رقص و موسیقی، شریعت کی تضحیک و تمسخر وغیرہ بند ہو گیا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد پھر یہ امراض سیلاب کی طرح امنڈ آئے۔

اٹھارویں صدی کے نصف اوّل میں شاہ ولی اللہ نے کوشش کی کہ عوام و خواص کو تصوف کی پیچیدہ بھول بھلیوں سے نکال کر کھلی فضا میں لے آئیں اور کتاب اللہ کو سمجھنے سمجھانے پر مائل کریں انھوں نے ہر طرح کی مخالفت کے باوجود پہلی بار قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا، فرنگی محل اور پوربی اضلاع میں فلسفہ و منطق کا جو سیلاب آیا ہوا تھا اس پر بند باندھنے کی کوشش کی، اپنے زمانے کے کرامت فروشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تقلید جامد کے علمبرداروں پر ضرب لگائی اجتہاد کے مقفل دروازے کو کھول دیا اور مذہبی و فقہی تفریق و فرقہ بندی کی مخالفت کی۔ انھوں نے اپنے زمانہ کے صوفیا سے جو توہم پرستی میں قوم کو مبتلا کر رہے تھے اور اس دور کی بے عملی و افسردگی

---

[۱] رود کوثر

میں اضافے کررہے تھے۔ کہا ــ "کرامات فروشان ایں زمانہ ہمہ الاماشاء اللہ طلسمات ونیرنگیاں را کرامات دانستہ اند"۔ شاہ صاحب نے تصوف کے ان منفی اثرات کو محسوس کیا جن کے نتیجے میں لوگ اجتماعی وسیاسی زندگی کی اہم ذمہ داریوں سے غافل ہوتے جارہے تھے اور خطر پسندی اور خود اعتمادی کے اوصاف سے محروم ہوگئے تھے۔ انھوں نے انتہائی نفی خودی کو مضر قرار دیا اور صوفیاء کے اس رویہ پر تنقید کی؛

"ہم چنیں جماعتے از متصوفہ کہ در زمان ما پیدا شدہ اند تکلیف شرائع را سہل گرفتہ اند و بعضے نصوص را بر مقاصد فاسدہ گرفتہ اند[۱]"

انھوں نے اسلام کی ابتدائی سادگی کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور رسوم عجم اور توہمات اہلِ ہنود سے خبردار کیا:

"عادات و رسوم عرب اوّل کہ منشاء آنحضرت صلعم از دست نہ دہیم و رسوم عجم وعادات ہنود را از درمیانِ خود بگذاریم"۔(تفہیمات)

شاہ صاحب نے ان رسموں پر جو اہلِ ہنود سے مسلمانوں میں آگئی تھیں مثلاً نکاح بیوگان سے پرہیز، بڑے بڑے مہر باندھنا، اور خوشی وغمی کے موقع پر اسراف پر سخت تنقید کی انھوں نے امراء کو آگاہ کیا:۔

"اے امیرو! دیکھو تم خدا سے نہیں ڈرتے دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جارہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں سے بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہورہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم وگداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی اور طرف منعطف نہیں ہوتی ہے[۲]"

---

[۱] تفہیمات الٰہیہ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی [۲] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ مقدمہ از پروفیسر خلیق انجم مطبوعہ دار المصنفین دہلی ص۹

شاہ صاحب نے امراء کی تعیش پسندیوں اور اخلاقی خرابیوں کی طرف متوجہ کرنے کے علاوہ سب سے بڑا کام یہ کیا کہ عقل انسانی کی فضیلت کو پھر سے نمایاں کیا اس عہد میں عقل وشعور پر سے اعتماد بالکل رخصت ہوچکا تھا تغیر وانقلاب، اجتہاد غور وفکر اور ایجاد واختراع کے دروازے بند ہوچکے تھے۔ رندی وقلندری اور عشق وسرمستی کے سمندر میں ہر شخص غوطہ زن نظر آرہا تھا عمر خیام کی طرح اس عہد کے لوگوں کو بھی عقل کی نارسائیوں کا شدید احساس تھا حقیقت کے بارے میں یہ تصور جڑ پکڑ چکا تھا کہ اس کا ادراک صرف باطنی پُراسرار تجربات کے ذریعہ ہوسکتا ہے اور اس تک انسان کی رسائی حواس وعقل کے ذریعہ ممکن نہیں۔ عقل پر اس بے اعتمادی کے نتیجے میں تشکیک وبے یقینی کا مرض پھیلتا جارہا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن کی رائے درست ہے کہ:

> "جب عقل کے فیصلے حتمی اور قابل اعتماد نہیں تو پھر حکماء، اہل فقہ اور سیاست کے سارے ضابطے قاعدے آئین وآداب بہت کچھ بے معنی قرار پائے عقل نارسا ہو تو کسی کے لب پر دعویٰ صداقت زیب نہیں دیتا ہر راستہ ہر تصور حقیقت تک پہونچا سکتا ہے اور کوئی رویہ وتصور آخری نہیں" [۱]

عقل کے مقابلے میں عشق پر زیادہ زور دینے کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ لوگ حقیقت کو ناقابلِ ادراک سمجھ کر عمل سے کنارہ کش ہوگئے۔ رندی وقلندری دلچسپ مشغلہ بن گئی اصلاح حال کا تصور محو ہوگیا۔ غور وفکر اور تحقیق وتجسس کے راستے مسدود ہوگئے۔ مجبوری ومظلومیت کے احساس میں لوگوں کو لذت ملنے لگی۔

ان حالات میں شاہ ولی اللہ نے قرآن کی تعلیمات کو عقل کی روشنی میں پیش کیا اور تشکیک وبے یقینی سے نجات دلانے کے لیے علم وحکمت کی شمع جلائی حجۃ اللہ البالغہ کی تصنیف کا پس منظر بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے فرمایا کہ مصطفوی شریعت کے لیے وقت آگیا کہ اسے برہان ودلیل کے پیراہن میں آراستہ کرکے میدان میں لایا جائے۔

---

[۱] دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی پس منظر۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ دانش محل لکھنؤ ص ۳۲۳

اس طرح انھوں نے شریعت محمدی کی مصلحتوں پر غور وفکر کا راستہ کھول دیا لیکن شاہ صاحب کے ہمہ گیر اثرات اس دور پر نہ پڑ سکے وہ نہ تو گوشہ نشین صوفیا کو میدان عمل میں اتار سکے اور نہ توہمات و تعیشات کے سیلاب کو روک سکے اس لیے کہ اس معاشرہ کے رستے ہوئے ناسوروں نے پوری ہیئت اجتماعی کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا کہ اس میں کسی طرح کی پیوندکاری اور جزوی اصلاح کی گنجائش باقی نہیں تھی۔ ڈاکٹر محمد حسن کا خیال صحیح ہے:

> "شاہ ولی اللہ کی تمام کوششوں کے باوجود ان کا دور ہیئتِ اجتماعی کے تصور سے زیادہ سے زیادہ بیگانہ ہوتا جارہا تھا۔ پوری سوسائٹی کی سطح پر سوچنے کے بجائے لوگ خود اپنی نجی اور ذاتی زندگی کی سطح پر سوچنے لگے تھے۔ اس لیے اس دور کی ادبیات میں اخلاقیات کے جن تصورات کا بار بار ذکر ملتا ہے وہ اجتماعی اور سماجی اخلاقیات سے متعلق نہیں بلکہ نجی اور انفرادی زندگی سے متعلق ہے۔"

شاہ صاحب کو یہ اندازہ تھا کہ ان کے معاشرے کی رگ و پے میں تصوف کا خمار اترا ہوا ہے وہ خود بھی اس بزم کے قدح خوار تھے۔ لیکن ان کی کوشش انفرادی نوعیت کی تھی اور وہ اجتماعی تحریک کی شکل اختیار نہ کرسکی۔ انھوں نے تصوف کے روایتی نظام کو چیلنج نہ کیا اور اسے برقرار رکھتے ہوئے معاشرے کا رخ اجتماعی مسائل کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب ان کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> "ہر چندکہ مجدد الف ثانی اور وہابی سلسلہ کا اس دور میں خاصہ اثر تھا اور خود شاہ ولی اللہ نے بھی مختلف بدعتوں کی اور اس کے ساتھ ساتھ مزار پرستی و توہم پرستی کی مخالفت کی لیکن تصوف کی مخالفت نہیں کی۔ انھوں نے مجدد صاحب کی طرح وحدت الوجود کا بھی مکمل طور پر رد نہیں کیا۔ بلکہ اپنے مکتوب مدنی میں انھوں نے ابن عربی کے وحدت الوجود اور مجدد الف ثانی کے وحدت الشہود کو ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ان دونوں باتوں سے اس دور کے کردار و مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی ایک طرف

زمانہ کا رخ اجتماعیت کے بجائے انفرادیت اور نفسی نفسی کی طرف تھا اور دوسری طرف تصوف کا اثر اس قدر گہرا تھا کہ علماء و اکابر تک پر اس کی چھاپ نمایاں ہونے لگی تھی"۔[۱]

پھر بھی شاہ صاحب کی مذہبی احیاء کی کوششوں کا ایک حلقہ پر گہرا اثر پڑا اور اودھ میں اس کے اثرات کی لہریں آئیں لیکن مسلم عوام کی حالت میں کوئی تغیر رونما نہ ہوا اور ہنوز گمراہ پیروں اور صوفیوں کے طلسم میں وہ گرفتار رہے۔ ان کی اس افسوسناک حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ محمد اکرام رقمطراز ہیں:

"اگر وہ (نومسلم) پہلے مندروں میں مورتیوں کے سامنے ماتھا ٹیکتے تھے تو وہ اب مسلمان پیروں اور قبروں کے سامنے سجدے کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے اور پجاریوں اور برہمنوں کی جگہ مسلمان پیروں نے لے لی تھی جن کے نزدیک انسان کی روحانی تربیت کے لیے اسلام کی پابندی واعمال حسنہ اور سنت نبوی کی پیروی ضروری نہیں تھی بلکہ یہ مدعا مراقبوں وظیفوں اور مرشد کی توجہ سے حاصل ہو جاتا تھا۔ تعویذوں اور گنڈوں کا بہت زور تھا بیماریاں دور کرنے یا اور دوسرے مقاصد کے لیے سب سے زیادہ کوشش تعویذوں اور گنڈوں کی تلاش میں کی جاتی۔ ہندو جوگی اور مسلمان پیر کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر خوش اعتقادوں کو دیتے اور یوں انھیں حصول مدعا کے صحیح اسلامی طریقوں سے باز رکھتے معاشرتی رسموں کے اعتبار سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی بڑا فرق نہ تھا۔ اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو لیکن اب بھوت پریت کے ڈر اور دوسرے ڈر سے روحانی زندگی کا سکون تلف ہو رہا تھا۔ بیاہ شادی اور تجہیز وتکفین کے متعلق اسلامی احکام نہایت سادہ

---

[۱] دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر۔ ڈاکٹر محمد حسن صہ ۹۱

معقول اور دین و دنیا کی بھلائی پر مبنی تھے لیکن مقامی اثرات سے ان کی جگہ ایسی خلافِ شرع رسموں نے لے لی تھی جن میں فضول خرچی تضیع اوقات اور دوسری بیسیوں قباحتیں تھیں"۔[۱]

اس عہد میں اودھ کو خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے ایک تربیت یافتہ اور اسی سرزمین کے چشم و چراغ سید احمد بریلوی نے بھی اپنی اصلاحی کوششوں کا مرکز بنایا۔ انھوں نے گمراہ صوفیا پر تنقید کی اور تصوف کو شریعت کے سانچے میں ڈھال کر اور جادۂ عمل کی شکل دے کر پیش کیا۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحئی نے جو سید احمد کے رفقاء خاص تھے "صراط مستقیم" نام کی کتاب لکھی جس میں اس دور کے روحانی امراض اور ان کے اصلاحی پروگرام کی تفصیلات ہیں اس میں اعلان کیا گیا ہے ــــ "تمام رسوم ہند و سندھ و فارس و روم را کہ خلاف محمد عربیؐ باشد یا زیادتی از طریقہ صحابہ شود ترک می نماید و انکار و کراہت برآں اظہار کنند"۔[۲]

اس کتاب میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مسلمانوں کی جن خرابیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اس طرح ہیں ـــ

(۱) شرع کی مخالفت اور کلام ملحدانہ اور مشرک آمیز اشغال قبیحہ کی اشاعت۔

(۲) خدا اور رسول کے متعلق کلمات بے ادبانہ کا صدور۔

(۳) مسئلہ تقدیر میں غیر ضروری قیل و قال اور بحث و جدال کا اظہار۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں من جملہ دیگر لاحاصل ذہنی ورزشوں کے ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ تقدیر کے مسئلہ پر لوگ بڑے جوش و خروش سے مباحثے و مجادلے کرتے تھے۔ سید احمد اور ان کے احباب نے اس معاملہ میں توازن کا راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور واضح کیا کہ خدا کی ہستی اور اس کی قدرت ایسے مسائل ہیں کہ ان میں منطق اور دلائل کی مدد سے انسان کسی یقینی نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتا۔ ان مسائل پر ایمان بالغیب

---

[۱] موجِ کوثر۔ شیخ محمد اکرام ص۷ [۲] صراطِ مستقیم۔ اسماعیل شہید۔ کتب خانہ اشرفیہ۔ دیو بند ص۱۳

ہی عقل اور سمجھ کا راستہ ہے۔ انھوں نے اس کے بجائے آیات الٰہی، خدا کی مخلوق اور کائنات کے ٹھوس حقائق پر غور و خوض اور تلاش و تحقیق کرنے کا مشورہ دیا۔ ان حضرات نے مرشد کی تعظیم میں مبالغہ، قبروں پر سجدہ کرنے اور مرادیں مانگنے اور فضول خرچی کرنے اور نذر و نیاز سے روکا۔ شادی بیاہ اور ختنہ کے موقع پر دھوم دھام اور فضول رسموں کی ملامت کی۔ انھوں نے خانقاہیت اور گوشہ گیری کے بجائے مجاہدہ اور اجتماعی صلاح و فلاح کے لیے اپنے احباب کو تیار کیا؛ اودھ کے علاقوں میں ان کی اس قدر مقبولیت بڑھ گئی کہ وہ جہاں جاتے سیکڑوں لوگ ان کے ہمراہ ہوتے اودھ کے رؤسا، امرا، اور سجادہ نشینوں نے ان کی پذیرائی کی۔ صاحب مخزن احمدی نے لکھا ہے کہ غازی الدین حیدر کے نائب السلطنت آغا میر نے ان کو لکھنو مدعو کیا اور یہ التماس کیا کہ —"آپ کے وعظ و تذکیر کی شہرت زمانہ بھر میں پھیل چکی ہے۔ اگر اہل لکھنؤ کو عموماً اور مجھ مشتاق و طلب گار کو خصوصاً تشریف آوری سے نوازیں تو یہ امر رشتہ برادری، مروّت و عالی حوصلگی سے خالی نہ ہوگا" معتمد الدولہ کے اس خط سے سید احمد کی اودھ میں مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مورخین رقم طراز ہیں کہ نواب اودھ کی فوج میں بلند عہدوں پر فائز افراد بھی ان کے حلقہ عقیدت میں شامل تھے۔ مثلاً فقیر محمد خاں رسالدار، عبدالباقی خاں قندھاری وغیرہ۔ سید صاحب نے لکھنؤ میں ڈھائی ماہ قیام کیا۔ اس وقت کا لکھنؤ اپنی رنگین مزاجی، توہم پرستی اور لہو و لعب میں نقطۂ عروج پر تھا۔ مگر سید صاحب کی کاوشوں نے بہت سے لوگوں کے اندر معاشرہ کی عام روش سے ہٹ کر اپنی زندگی کی اصلاح کا جذبہ پیدا کر دیا۔ لکھنو میں ان کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے غلام رسول مہر رقم طراز ہیں:

> ہر ہفتہ جمعہ سے پہلے عصر تک ٹیلہ والی مسجد میں مولانا عبدالحئی وعظ کہتے۔ ہزاروں آدمی شریک ہوتے، وہ ہر پیغمبر کا اُسوہ پوری تفصیل سے بیان کرتے اور ساتھ ساتھ بتاتے جاتے کہ خود ان کے عہد میں لوگوں کے اندر کیا کیا اعتقادی اور عملی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں سورہ انبیاء

کے پانچویں رکوع کی تفسیر کے سلسلے میں مولانا نے تعزیہ داری، عرس
راگ رنگ گور پرستی، پیر پرستی، داڑھیاں منڈانا، لبیں بڑھانا، پٹے
رکھانا، مسی لگانا، کبوتر اڑانا، مرغ لڑانا، سیٹی بجانا، پتنگ اڑانا اور اس
قسم کی باتوں سے سختی سے روکا۔ وعظ میں فرنگی محل کے علماء، مولانا سید
دلدار علی مجتہد کے شاگرد اور دوسرے عمائد علم موجود تھے، سب پر سکتہ طاری
تھا اور زار زار رو دیتے تھے۔"[1]

معتمد الدولہ نے سید صاحب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو پسند نہ کیا۔ بعض علماء کو اپنے مفادات بھی مجروح ہوتے نظر آئے، چنانچہ سید صاحب کو وہاں سے رخت سفر باندھنا پڑا۔ انھوں نے تھوڑے عرصے کے لیے اودھ میں حرکت و انقلاب کی فضا پیدا کردی اور ہمت و حوصلہ سے کام لینے کا سبق دیا۔ بالآخر ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں اپنے احباب کے ساتھ سکھوں کے خلاف جہاد میں شہید ہو گئے۔

ان کوششوں کے ماسوا اودھ کا سواد اعظم اسی راستے پر گامزن رہا جدھر وہ چل رہا تھا، صوفیا کی خانقاہوں اور بزرگوں کے مزاروں پر مسلمان عوام کے ساتھ ہنود عوام کا بھی زبردست مجمع ہوتا تھا۔ سید سالار مسعود غازیؒ حضرت جہانگیر سمنانیؒ شاہ مدارؒ اور شاہ مینائؒ کے مزاروں پر غیر مسلموں کی بڑی تعداد مسلمانوں کے ساتھ نذر و نیاز میں شریک رہتی۔ اہل ہنود میں ایک طبقہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام کی ہنسلی اپنے بچوں کے گلے میں ڈالتا ان کی نیاز کا کھانا پکواتا، اپنے بچوں کے نام کے تعزیے مسلمانوں کے گھروں سے اٹھواتا کچھ لوگ چھپ کر مسلمانوں کو بقول مرزا قتیل[2] عرس کے لیے روپیہ دیتا اور وہ کسی چشتیہ قادریہ یا سہروردیہ بزرگ کا عرس کرواتے تھے۔ بعض شاہ مدار کے نام کی چوٹی سروں پر رکھتے اور جب بچہ بڑا ہو جاتا تو اسے شاہ مدار کے مزار پر لے جا کر منڈواتے اور اس بچے کی موت سے بے خوف ہو جاتے۔ قتیل لکھتا

---

[1] سید احمد شہید۔ غلام رسول مہر کتاب منزل لاہور ۱۹۵۳ء ص ۱۶ [2] ہفت تماشا۔ مرزا قتیل ص ۱۰۱

ہے کہ رذیل طبقہ کے مسلمان جوق درجوق مکف پور سیاہ جھنڈے اٹھائے ہوئے جاتے اور شاہ مدار کو رسولؐ اور ائمہ اسلام سے بھی بالاتر سمجھتے بلکہ خدا کے برابر پہنچا دیتے۔ شاہ مدار کے مرید (اودھ کے) گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں موجود تھے۔ اور تقریباً ہر رقبہ میں مداری فقیروں کے تکیے موجود تھے ان کے مزار کے مجاور ہندوؤں کو بتاتے کہ رام کنھیا اور بھوانی سب شاہ مدار ہی کے روپ ہیں اور مسلمانوں کو بتاتے کہ مرتضیٰ، حسن، حسین اور محمد سب شاہ مدار کے القاب ہیں، اسی طرح اودھ میں شیخ سدّو کی بڑی دھوم دھام تھی۔ ان کے بارے میں قتیل لکھتا ہے — "بعض نچلے طبقہ کے مسلمان اور کچھ اس طرح کے ہندو شیخ سدو کی پرستش بھی کرتے ہیں ان کی نذر کے لیے زیادہ تر بکرا بکری ذبح کر کے پکائی جاتی ہے۔ یہ کھانا ہر شخص کو نہیں کھلاتے کیوں کہ جو ایک مرتبہ ان کی نذر کا کھانا کھالیتا اس کی گردن پر شیخ سدّو سوار ہو کر ہر سال اس سے نذر کا بکرا وصول کرتے، جو نذر کا بکرا نہیں چڑھاتا اس کا سر خود بخود چکرانے لگتا دونوں آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور بدن میں درد ہونے لگتا۔ جب وہ نذر پوری کر دیتا تو بھلا چنگا ہو جاتا۔ چونکہ انسان کا واہمہ خلاق ہوتا ہے اس لیے ان اجلاف کا ایسے مصائب میں گرفتار ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں"[1]

دوسری طرف ہمارے صوفیا نے ہندو دیوتاؤں کو احترام کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ تو سری کرشن جی اور رام چندر جی کو انبیاء کا درجہ دینے لگے۔ دارا شکوہ کے دور ہی سے براگ و تصوف میں کچھ لوگوں کو فرق نہیں محسوس ہوتا تھا مغل بادشاہ محمد شاہ براگیوں سے زبردست عقیدت رکھتا تھا، اور آخر میں وہ سوامی نارائن سنگھ کا جو شیو نارائن سلسلہ کا بانی تھا مرید ہو گیا۔ یہ سوامی وحدت الوجود کا قائل تھا اور ہر فرقے کے لوگوں کو مرید کرتا تھا۔ اس زمانہ کے لوگ بکثرت چار ابرو صاف کراتے اور یوگیوں جیسی وضع اختیار کر لیتے تھے۔ بھگوان داس ہندی نے مرزا گرامی کے

---

[1] ہفت تماشا، مرزا قتیل، مکتبہ برہان دہلی ص۱۰۷

بارے میں لکھا ہے ۔ "انھوں نے وسیع المشربی کا شیوہ اختیار کرلیا تھا ان کا ظاہری لباس صوفیا و مشائخ سے مشابہ تھا لیکن ہندوستان کے قلندروں کی وضع میں زندگی گزارتے تھے۔ داڑھی مونچھ اور بھوؤں کو خیرباد کہا اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے بڑی گرم جوشی سے ملتے تھے"۔[1]

اسی طرح اس عہد کے اور کئی اہل قلم اور شعرا کے بارے میں مذکور ہے کہ داڑھی مونچھ منڈا کر انھوں نے جوگیوں کی وضع اختیار کرلی تھی۔ غرض صوفیوں سربرآوردہ لوگوں اور بادشاہوں کے اس رویّے کے سبب سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ان کو پاکیزہ خیال بے ریا اور تارک الدنیا خیال کرتا اور ان کی روحانیت میں یقین رکھتا۔ رفتہ رفتہ جوگیوں اور سنیاسیوں کے عقائد مسلم معاشرہ کے ایک حصہ میں نفوذ کرگئے اور کچھ لوگوں نے ان کی مصاحبت اختیار کرلی۔ عارف سبحانی نام کے ایک درویش مسجد میں عبادت اور مندر میں ڈنڈوت کرتے تھے۔ آج کے ہندوستان میں بھی ڈاکٹر محمد عمر کی رائے میں دو ایسے فرقے مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں جن کے عقائد و اطوار پر سنیاسیوں اور جوگیوں کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں یہ ہیں مداریہ اور جلالیہ۔[2]

اس عہد میں تصوف اپنے دوسرے پہلو اور اپنے جزو خاص یعنی عشق کی تعلیم کے معاملے میں بھی صحیح ڈگر پر قائم نہ رہ سکا۔ بلکہ ایسے غلط راستوں پر چل نکلا جس کے اثرات سے تمدن میں مذموم افعال کی بنیاد پڑ گئی جیسا کہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی رقم طراز ہیں:

"کم سواد صوفیوں کو حقیقت کی تلاش میں مجاز ملا اور یہ لوگ مجاز میں الجھ کر اسکو حقیقت سمجھ رہے تھے۔ اس طور پر ظاہر یا مظہر پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ حقیقت یا حق معدوم ہوگیا۔ اس ظاہر پرستی نے ہر چیز پر

---

[1] بحوالہ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر۔ ڈاکٹر محمد عمر پبلیکیشنز ڈویژن دہلی صفحہ ۲
[2] " " " " " صفحہ ۳۷

ظاہر پرستی کا رنگ چڑھا دیا۔ عقائد رسوم مذہب معاشرت اور
معیشت سب پر مصنوعی و رسمی جذبات کا رنگ چڑھ گیا"۔ ؎۱

اس طرح عشق کی بوالعجبیاں ہیں اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں دہلی میں بڑی مکروہ شکل میں نظر آتی ہیں۔ جبکہ لڑکوں سے عشق کرنا اور اس میں معشوق حقیقی کی جھلک دیکھنا ایک مشغلہ بن گیا۔ ہندوستانی معاشرہ میں یہ مرض ایران سے آیا تھا جب اخلاقی قیود کے بندھن ڈھیلے پڑ گئے تو رندی و بوالہوسی پر عشق مجازی کا یہ غلاف چڑھانے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی اور سیدھے طوائف کے عشق کو عشقِ حقیقی کا ایک زینہ بنا لیا گیا۔ اس زوال آمادہ معاشرہ کے پاس اپنے گناہوں کی تاویل کے لیے اس سے اچھا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا۔ غرض تصوف اس دور کے لیے ایک خواب پریشاں کی مانند تھا جس کی ہر شخص اپنے اپنے حوصلہ اور ذوق کے مطابق تاویل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن کی رائے صحیح ہے:۔

"ہر دور کو ایک فکری سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ہر شخص کا ایک فلسفۂ حیات ہوتا ہے۔ خواہ شعوری یا نیم شعوری طور پر اس فلسفہ سے وہ اپنے اعمال کا جواز ڈھونڈھتا ہے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں تک کو صحیح اور ناگزیر قرار دیتا ہے۔ اِس طرح اِس دور کو اپنی رنگینی و سرمستی اور رندی کے لیے ایک فکری سہارے کی ضرورت تھی۔ یہ پناہ گاہ اس نے تصوف میں تلاش کر لی"۔ ؎۲

حاصل کلام یہ ہے کہ فرار کی یہ ذہنیت جو زندگی کے دیگر گوشوں میں اپنے لیے عافیت گاہیں تراش چکی تھی تصوف میں اپنی روحانی اور اخلاقی زندگی کے لیے ایک سہل اور آسان پناہ گاہ بنانے میں کامیاب ہو گئی۔

؎۱ دہلی کا دبستانِ شاعری۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی فروغ اردو لکھنؤ ص ۳۹
؎۲ دہلی کی شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر۔ ڈاکٹر محمد حسن دانش محل لکھنو ص ۹۱

لیکن یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ دربار کے حلقۂ اثر سے دور عوام اور علماء کا ایک طبقہ ان پناہ گاہوں کو اپنے لیے باعث ننگ تصور کرتا رہا۔ اس عہد میں علماء و شیوخ کی ایک معتدبہ تعداد حق و راستی پر قائم تھی۔ لکھنؤ، خیر آباد، کاکوری، ہردوئی، بہرائچ، سندیلہ، دیوہ، سلون، کچھوچھہ میں ایسے فقراء و صوفیا بھی موجود تھے جو مکر و ریا کا دام تزویر بچھانے کے بجائے شریعت کے اوامر و نواہی کی تبلیغ میں مصروف تھے اور ان کے طفیل میں عوام کا ایک بڑا طبقہ اودھ کے امراء و سربرآوردہ طبقہ کی ساری عیاشیوں اور رنگینیوں کے باوجود شریعت کی سادگی پر عمل کر رہا تھا اور عیش پرست طبقہ کی رنگ رلیاں اس پر اثر انداز نہ ہو سکی تھیں۔ وہ اپنے معاشی مفادات کو قربان کر کے، عسرت و تنگی کی زندگی گزار کر اور اپنی قناعت پسند اور سادہ زندگی سے معصیت کے اندھیروں میں روشنی کے مینار کی مانند جگمگا رہے تھے۔

اودھ کے اس ماحول میں شیعہ علماء کا ایک طبقہ بھی حق و راستی پر قائم تھا۔ یہ حضرات تصوف کے بالمقابل شریعت پر اصولی اعتبار سے زور دیتے تھے۔ خاص طور پر تصوف میں نفی خودی کے عنصر کے قائل نہ تھے۔ اور ترک اسباب و علائق دنیا کے بجائے شریعت پر قائم رہ کر دنیا کو برتنے کی تعلیم دیتے تھے۔ لیکن نوابین و بادشاہان اودھ کے عہد میں انھوں نے عوام سے شریعت پر عمل کرانے اور امراء و حکمراں کو اس کا پابند بنانے میں اپنی بے بسی محسوس کرتے ہوئے اپنی اس ذمہ داری سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اوامر و نواہی کی تبلیغ و تلقین کی کوئی مہم نہ چلا سکے۔ آگے چل کر حکمرانوں کی مذہبی غلط کاریوں کو بھی انھوں نے نظر انداز کیا اور ان میں سے اکثر نے جلب منفعت کو اپنا مقصود حیات بنا لیا اور اسلام کی تبلیغ کے بجائے فقط شیعیت کی چند روایات پر بے پناہ زور دینے لگے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اودھ کے صوفیاء کے مزاروں پر اور عرسوں اور حال و قال کی محفلوں میں شیعہ حضرات شرکت نہیں کرتے تھے۔ قبر پرستی اور فقرا نوازی کا وہ انداز جو سنی عوام نے اختیار کر رکھا تھا اس سے یہ محفوظ تھے مگر ہند و مذہب کی روایات و

رسوم کا ان پر اچھا خاصا اثر پڑا۔ انھوں نے بھی ڈھیرے ندر و نیاز کی خاطر دوسروں کی طرح درگاہیں بنالیں اور انھی رسوم میں مبتلا ہو گئے جو اوروں میں رائج تھیں۔ اس کے علاوہ توہم پرستی وہ مرض تھا جس میں وہ دوسروں سے بڑھ چڑھ کر شریک تھے جنوں اور دیگر مابعد الطبعی مخلوقات پر پختہ عقیدہ ہو گیا ندر و نیاز گنڈے تعویز گھر گھر میں رائج ہو گئے۔ زندگی کے ہر موڑ پر ان مابعد الطبعی قوتوں سے امداد و استعانت طلب کی جانے لگی، دفع بلیات کے طرح طرح کے نسخے ایجاد ہوئے اور اچھے و برے شگون کا لحاظ کیا جانے لگا۔ مہینہ کے کچھ دن اور تاریخیں مبغوض ہو گئیں ارواح خبیثہ، ارواح صالحہ دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی جانے لگی۔ ہر گھرانے میں شادی کے موقع پر بابا فرید کا پوڑا ایک کاغذ کے تھیلے میں شکر باندھ دیتے) ضرور جاتا تھا جس کے بغیر شادی کی تکمیل نہ ہوتی شادی کے موقع پر ہندوانہ رسوم شیعہ سنی سبھی میں رائج ہو گئیں مثلاً۔ لڑکے لڑکی کو زرد کپڑا پہنانا کلائی میں ریشمی کلاوہ باندھنا عقد سے فارغ ہونے تک دولھا کا ہاتھ میں لوہے کا ہتھیار پکڑے رہنا۔ دولہن کے گھر سے چنی لے جانا وغیرہ۔

شیعہ حضرات نے حضرت علی کا دسترخوان بچھانا اور یہ تصور کر کے کہ وہ دسترخوان پر آگئے ہیں ان کے دست مبارک کے نشانات ڈھونڈھنے شروع کر دینا چنانچہ قتیل لکھتا ہے:

"ندر کے کھانے پر فاتحہ دینے کا طریقہ تورانیوں میں اور ان کی اولاد میں رائج تھا، اب اماموں کے ان پیروؤں میں بھی رواج پا گیا ہے جو ایرانی الاصل ہیں"۔[1]

اٹھارویں صدی کے اودھ میں زندہ اور چلتے پھرتے پیروں سے زیادہ ان بزرگوں کی قبروں سے لوگوں کو عقیدت تھی جو اس دنیا سے جا چکے تھے ہر ہر طبقہ اور بستی میں کوئی نہ کوئی بزرگ اس علاقہ کی حفاظت اور دیکھ ریکھ کے لیے متعین تھے۔ ان کی قبر اس علاقہ میں مرجع خلائق بنی ہوئی تھی چنانچہ قتیل لکھتا ہے:

---

[1] ہفت تماشا۔ مرزا قتیل ص۱۵۶

"ہر قصبہ میں کسی نہ کسی صوفی کی قبر بھی ضرور ہوتی ہے جنھیں مخدوم صاحب کہا جاتا ہے۔ اور اس ولایت کا والی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اس قصبہ کی آبادی کو ان کے قدموں کی برکت سمجھتے ہیں اور ان کی کرامتوں کے دفتر محفلوں اور مجلسوں میں بیان کیے جاتے تھے"[۱]

اودھ کے سنیوں نے اگر قبروں سے لو لگا رکھی تھی تو شیعوں کا یہ حال تھا کہ عزاداری کے مراسم کے دائرہ میں انھوں نے پورے مذہب اور اس کے جملہ تقاضوں کو محدود کر دیا تھا عزاداری کے مراسم ثقافتی حیثیت اختیار کر گئے تھے اودھ میں یہ اس قدر مقبول ہوئے کہ قریہ قریہ میں آبادی کا ہر طبقہ جس جوش و خروش سے ان میں حصہ لیتا تھا اور کسی تقریب میں نہ لیتا تھا۔ ڈاکٹر نیر مسعود کا خیال درست ہے کہ یہ مراسم اس عہد میں فروع مذاہب سے گزر کر اصول تمدن میں داخل ہو چکے تھے:۔

"فروع پر زور دینے والے اور غیر اہم اور غیر ضروری باتوں کو ضروری سمجھنے کا مرض اس حد تک عام ہو گیا تھا کہ مذہب کی بنیادی تعلیمات پس پشت ڈال دی گئی تھیں اور غیر مسلموں سے بہت سے امور میں مشابہت و مطابقت پیدا کر لی گئی تھی۔ چنانچہ مراد بر آنے پر جناب سیدہ کی کہانی سنی جاتی جس طرح غیر مسلم اپنی آرزوؤں کی تکمیل پر ست نرائن کی کتھا سنتے ہیں — سوز خوانی کے لیے ہندوستانی موسیقی کی قدیم صنف دُھرپد کا انتخاب کیا گیا"[۲]

غرض اس عہد کے اودھ میں ایران سے جو صوفیانہ سلسلے آئے ان کے مشاغل میں مرور ایام کے ساتھ طرح طرح کی آمیزشیں ہو گئی تھیں اور یہ اسلام کی سادہ تعلیمات سے بہت دور نکل گئے تھے۔ تصوف کے نام پر ہر طرح کی توہم پرستی جاری تھی اور یہ اصلاح کردار اور تزکیہ نفس کے بجائے چند رسوم و روایات کا مجموعہ بن گیا تھا۔ چنانچہ اس عہد کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر آشیر وادی لال لکھتے ہیں:۔

"اپنے آسان اور واضح مذہبی اصولوں کے باوجود بھی وہ (مسلمان) پرانی یادگاروں

---

[۱] ہفت تماشا، مرزا قتیل صہ ۱۶۹ [۲] رجب علی بیگ سرور۔ ڈاکٹر نیر مسعود، شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی صہ ۳۵

کی پوجا کرتے قبروں کی عزت کرتے اور سادھوؤں اور بے پڑھے لکھے مذہبی فقیروں کے آگے سر تسلیم خم کرتے۔ اودھ میں اپنی سب سے اہم زیارت گاہ بہرائچ کے قصبہ میں مسلمان ہر سال ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے اور سالار مسعود کی قبر پر نذرانے چڑھاتے اور دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لیے ان سے استدعا کرتے"۔[۱]

تقریباً یہی بات ڈاکٹر وحید مرزا بھی اس عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس طرح کے صوفیوں قلندروں اور فقیروں کی بڑی تعداد کی اس عہد کے مسلم معاشرہ میں موجودگی اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ ہندوستان میں اسلام اپنے سادہ اور محتاط طریق عمل کو چھوڑ کر اور تکالیف شریعت کے سیدھے طریقے سے ہٹ کر رسوم و اوہام کا ایک مجموعہ بن گیا تھا جس میں مکروہات، توہمات اور پیر پرستی کا نہایت اہم رول تھا۔ یہ بات عام ہو گئی تھی کہ ہر آدمی کا اپنے لیے کسی روحانی پیشوا یا پیر سے رشتہ استوار کرنا ضروری ہے جس کے بارے میں عوام کا یہ خیال تھا کہ دنیا و عقبیٰ کی کامیابی کا انحصار اسی بات پر ہے"۔[۲]

ایک انگریز خاتون مسز کنسلے بھی جو شجاع الدولہ کے عہد میں الہ آباد میں کچھ دن مقیم رہی اس عہد کے شمالی ہند کے مسلمانوں کی روحانی و مذہبی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہے:

"مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح سائنس کے علوم سے نفرت کرتے تھے وہ اپنے سادہ اور عمل پر زور دینے والے مذہب کے باوجود درگاہوں، قبروں اور قدیم مذہبی یادگاروں کی پرستش کرتے تھے اور ہر طرح کے صوفیوں فقیروں کے آگے گردن جھکاتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں بہرائچ اور اودھ کے دوسرے مزارات پر جاتے اور قیمتی اشیاء کے نذرانے پیش کرتے تھے اور اپنے دنیاوی مقاصد کی تکمیل کے لیے مسعود

۱؎ اودھ کے دو نواب (ہندی) ڈاکٹر آشیر وادی لال شیولال اگروال کمپنی آگرہ ۱۹۵۷ء ص ۲۷۹

۲؎ بحوالہ Medieval Indian Culture ایجوکیشنل پبلشرز آگرہ ص ۲۳۰

غازی کی روح سے امداد طلب کرتے"۔

پیروں کی پرستش اور مزاروں اور خانقاہوں سے بے پناہ عقیدت اس دور میں عام تھی یہ رجحان صرف اودھ کے مسلمان عوام میں ہی نہیں بلکہ دہلی اور خود قلعہ معلیٰ کی فصیلوں میں موجود تھا۔ خود شاہانِ دہلی کی ضعیف الاعتقادی اس وقت شباب پر تھی۔ ایک واقعہ سے اس کا صحیح اندازہ ہوجائے گا جو ڈاکٹر محمد حسن نے وقائع اظفری کے حوالے سے نقل کیا ہے:

"وقائع اظفری میں مرزا علی بخت محمد ظہیر الدین اظفری نے جو شاہ عالم کے دور میں قلعہ معلیٰ میں قید تھے اور غلام قادر روہیلہ کے ہنگامہ کے بعد براہ لکھنؤ کرناٹک پہنچے قلعے کے اندر کے نقلی پیروں اور دھوکہ باز فقیروں کے متعدد واقعات لکھے ہیں جس سے اس دور کے صاحبان اقتدار کی ضعیف الاعتقادی پر روشنی پڑتی ہے اظفری نے ایک شاہ یقین کے قلعہ میں اثرات کے احوال لکھے ہیں اور انھوں نے جس جس طرح سے شہزادیوں کو بے وقوف بنایا ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً ایک جیونا بیگم کا واقعہ درج ہے جنھوں نے اپنے شہزادہ جواں بخت کے لکھنؤ چلے جانے پر پیروں فقیروں سے خود بھی وہاں پہنچنے کے لیے تعویذ گنڈے کرائے اس لیے کہ بیگم اور ان کے رشتہ دار قلعہ میں قید تھے۔ شاہ یقین نے اس معاملہ میں بیگم کو خوب بے وقوف بنایا اور یہ یقین دلایا کہ سال بھر کے اندر کسی دن موکلان غیبی کے ذریعہ جیونا بیگم کا پلنگ اٹھوا کر لکھنو بھیج دیا جائے گا۔ غرض مدت دراز تک جب بیگم کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور شاہ یقین کو راز فاش ہونے کا اندیشہ ہوا تو وہ اچانک غائب ہوگئے"۔

ایک جیونا بیگم تک یہ کیفیت محدود نہ تھی بلکہ پورا معاشرہ انھیں توہمات کے برگ و بار کے سہارے جی رہا تھا۔ دہلی سے لکھنو تک گنڈوں تعویزوں منتوں مرادوں عرسوں قوالیوں اور دفع بلیّات اور تکمیل خواہشات کے لیے نذر و نیاز اور اوراد وظائف کی

دھوم دھام تھی۔ محنت ومشقت جدو جہد اور عرق ریزی سے لوگوں کا دل سرد تھا۔ عیش وعشرت کے سنہرے خوابوں سے لوگ مخمور رہنا چاہتے تھے اور جو آرزوئیں دست وبازو سے نہ پوری ہوتیں ان کے لیے غیبی طاقتوں پر انحصار کیا جاتا۔ مسائل کی گتھیوں کو عمل کے ناخن سے سلجھانے کے بجائے کرامات اور خوارق عادات کا سہارا تلاش کیا جاتا اور تصوف کے مرغزاروں میں اس طرح کی حسرتوں کی تکمیل کے لیے بڑے مواقع تھے۔ زندگی کے آلام سے فرار کی یہی آرزو انھیں طوائفوں کے عشرت کدوں میں لے جاتی اور اسی غرض سے وہ مکرو ریا کا جال بچھانے والے صوفیوں کی خانقاہوں میں حاضری دیتے۔ بقول خلیق نظامی "لوگ جس عقیدت سے خانقاہوں اور مزارات پر جاتے تھے اسی جوش اور ولولہ سے طوائفوں کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے"۔ ان کی رندی اور مذہبیت ساتھ ساتھ چلتی۔ عیش کوشی زندہ دلی اور نشاط پرستی کی یہ روایت دربار سے بازار تک اور دہلی سے لکھنؤ تک ہر جگہ رائج تھی ہر طرف ایک ہی طرح کے مسائل درپیش تھے اور ان کا ایک طرح کا علاج ہر جگہ اختیار کیا گیا تھا۔ اگر لکھنؤ میں نوابین درگاہ حضرت عباس میں حاضری دیتے تھے تو بادشاہان دہلی صوفیا کی محفلوں میں دست بستہ جاتے محمد شاہ نے شاہ مبارک کو برہان الطریقت شاہ رمز کو فصیح البیان اور شاہ بڈھا کو برہان الہدایت کا خطاب دیا تھا۔ بادشاہ کے اس رنگ کو دیکھ کر امراء اور وزراء پر بھی بزرگوں سے منتیں مانگنے اور تعویذ اور گنڈے طلب کرنے کا شوق چھا گیا' اب جسے دیکھئے ولایت کے منصب کا دعویدار بننے لگا حتیٰ کہ مورخین کے بقول گاؤں کے بازار کے کاریگروں تک نے نقلی عمامے اور جبّے پہننے شروع کر دیئے تھے۔ ●●

اپنے معاونین سے

ادارہ کا اکاؤنٹ IDARA-E-TAHQEEQ-O-TASNEEF-e-ISLAMI کے نام سے ہے۔ براہ کرم اپنا چیک یا ڈرافٹ اسی نام سے بھیجیں' اس میں کسی لفظ کی کمی بیشی سے زحمت ہوتی ہے۔ امید ہے آپ کا تعاون ہمیں مستقل حاصل رہے گا۔ (مینجر)